

ایلاف

(شعری مجموعہ)

رؤف خیر

Raouf Khair, M.A., Lecturer
9-10-202/19, Baith-ul-Khair,
Risala Bazar, Golconda,
HYDERABAD-500 008.

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

بار اول — تعداد : ایک ہزار

سالہ اشاعت : جنوری ۱۹۸۲ء

قیمت : دس روپے

کتابت : — ادارہ ”گلِ نو“ چھپتہ بازار حیدرآباد-۲

ناشر : — ”گلِ نو پبلیکیشنز“ چھپتہ بازار حیدرآباد-۲

ٹائٹل کی کتابت : — محمود سلیم

مطبع : — اعجاز پرنٹنگ پریس چھپتہ بازار حیدرآباد-۲

بہ اشتراک اردو اکیڈمی آنڈھرا پردیش حیدرآباد

ملنے کے پتے :

الیاکس ٹریڈرس ، شاہ علی بندہ حیدرآباد ۲-۵۰۰۰۰

اردو اکیڈمی ، مہک ڈپو ، اے سی گارڈز حیدرآباد ۲-۵۰۰۰۰

سیما پبلشرز اینڈ بکس پروموترس ، دینکٹ گیری نگر حیدرآباد ۲-۴۵

رؤف خیر ۱۲۷-۲-۱۳ سبزی منڈی حیدرآباد ۲-۲۶۷۷۰۰۵

۳

انتساب

عالات کے نشیب وفساد کے نام

تعارف

روف خیر	نام
بی لے (عثمانیہ)	تعلیم
سینو گرافر	پیشہ
۵ نومبر ۱۹۳۸ء	تاریخ پیدائش
حیدر آباد دکن	وطن
موقت ادارہ گل نوا	پتہ
پرائیویٹ، حیدر آباد ۵۰۰۰۰	

پیش لفظ

جمیل شیدائی

روڈنیر کی شاعری کی سب سے نمایاں خوبی اُن کے "ترائیبل" میں
 ترائیبل دراصل فرانسیسی صنفِ شاعری ہے جس میں آٹھ مصرعے
 دو قافیوں سے لکھے جاتے ہیں اور پہلا مصرع چوتھے اور ساتویں
 مصرع کی جگہ اور دوسرا مصرع آٹھویں یا آخری مصرع کی جگہ دہرایا
 جاتا ہے۔

اس صنفِ شاعری کی خوبی اور کامیابی اس بات میں مضمر ہے
 کہ مصرعوں کا اعادہ فطری جیسا ہو اور ناگزیر لگے اور اس طرح اعادہ
 سے مختلف معنی نکلتے ہوں یا نفسِ مضمون کی تشریح ہوتی ہو۔ ترائیبل
 کے تاریخی پس منظر کے بارے میں *P. Bloch* اور
W. Von Wartburg نے فرانسیسی زبان کی

ڈکٹری میں لکھا ہے کہ ترائیلے ۱۸۶۱ء تک نامعلوم سالفظ تھا حالانکہ یہ صنف بہت زیادہ قدیم ہے کیونکہ قرون وسطیٰ کے شاعر جیسے :
Deschamps اور *Trouvart* نے بھی ترائیلے لکھے ہیں۔ مگر پندرہویں صدی کے اواخر سے یہ صنف نظر انداز کر دی گئی اور پھر اسے سترہویں صدی میں : *Vincent Voiture* اور *Jean - de - La Fontaine* نے دوبارہ رائج کیا۔
 انگلستان میں صرف *Patric Carney* نے ۱۶۵۱ء میں چند مذہبی ترائیلے لکھے تھے۔ اس وقت سے اب تک اس صنف میں کوئی خاص کام نہیں ہوا مگر اب انگلستان میں ترائیلے لکھنے والے کئی شاعر ہیں جیسے : *W. E. Henery* وغیرہ۔

یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ہماری شاعری ترقی یافتہ زبانوں سے ہمیشہ متاثر رہی ہے خصوصاً اس فرانسیسی نظم کے فارم پر رُوف خیر کو جس طرح دسترس ہے، اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں بہت زیادہ وسعت ہے اور وہ کسی زبان کے کسی بھی فارم کی متحمل ہو سکتی ہے۔ رُوف خیر کے ترائیلے اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار سے متنوع اور دلچسپ ہیں مثلاً ان کا ایک

ترائیے ہے جس کا عنوان ہے ”اعراف“

میں جہاں ہوں وہاں اوس و خورج بھی ہیں
ایک آواز حق بھی، سمیہ بھی ہے
گھر کے آنگن البوہل کے کچ بھی ہیں
میں جہاں ہوں وہاں اوس و خورج بھی ہیں

چور، زانی، شرابی ہیں اور نج بھی ہیں
میں ہوں سب سے الگ سب سے رشتہ بھی ہے
میں جہاں ہوں وہاں اوس و خورج بھی ہیں
ایک آواز حق بھی، سمیہ بھی ہے

اس مختصر نظم (ترائیے) میں ہمارے معاشرے کی
کامیاب تصویر کشی کی گئی ہے۔ خیر و شر کی قوتیں اور ان کے
توازن سے سماجی اقدار تشکیل پاتے ہیں۔ چونکہ شاعر سماج ہی کا
ایک فرد ہوتا ہے اس لئے اس کا رشتہ سماج سے اٹوٹ ہے۔
اس کی انفرادیت اسے سب سے الگ تو کرتی ہے مگر الگ ہونے
کے احساس کے ساتھ

”میں ہوں سب سے الگ سب سے رشتہ بھی ہے“

یہی خاص بات رؤف خیر کے کلام میں ہوتی ہے کہ وہ ذات

کو معاشرے سے الگ کر کے نہیں دیکھتے بلکہ اس کا ایک حصہ ایک جز ہو کر اس پر نظر ڈالتے ہیں اور یاسیت کے احساس کے ساتھ صورت حال اور ماحول پر چست فقرے کتے ہوئے گزرتے جاتے ہیں انکی مجبوری جیسے ترسیلے کو دندا سے ظاہر ہوتی ہے ایک سماج کی مجبوری ہے۔ اس مجموعے میں بہت اچھی اچھی تنظیم ملتی ہیں جیسے ”دیوار“، ”انجام کار“، ”بیلیف“، ”بندگی“، ”گواہ گشتہ“ وغیرہ۔

Understanding Poetry Cleanth Brooks اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ شاعری ہمیں علم دیتی ہے۔ یہ علم خود ہمارے بارے میں ہی ہوتا ہے جو تجرباتی دنیا سے اخذ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ رؤف خیر کی تجرباتی دنیا کی وسعت سلم ہے اور بالغ شعور کی وجہ سے ان کے تجربے رائگاں نہیں جاتے بلکہ ہمارے ذہنوں پر ایک خاص کیفیت ترسم کر جاتے ہیں۔ *Wordsworth* نے شاعری کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو دوسرے انسانوں سے بات کرتا ہے اس لحاظ سے رؤف خیر کی باتیں بالکل گنجلک نہیں اور نہ *Soliloquy* کی طرح یہ باتیں خود سے ہوتی ہیں بلکہ ان کی باتوں میں متانت ہے، بھرپور اعتماد ہے لمبے کا

بانکین ہے اور سچا تجربہ ہے جو سننے والوں کو چونکاتا بھی
 ہے اور دعوتِ فکر بھی دیتا ہے۔

”اقرار اور رؤف خیر“

کے بارے میں

ڈاکٹر ظ۔ انصاری (پلٹنر، بمبئی، ۲۰ ستمبر ۱۹۷۷ء)

حیدرآباد کے رؤف خیر کا شعری مجموعہ کھولا تو ایسا معلوم ہوا کہ گیلی لکڑیوں کی ٹال پر جو ایندھن تلوایا۔ اس میں صندل کی ٹہنی بھی چلی آئی ہے۔ ہنکتی ہوئی..... رؤف خیر نے جہاں تک نظر گئی حسن اور درد سے آغلی ہے پڑوسی کے چولھے سے نہیں مانگی۔ کچی مشق کے باوجود وہ سچے شاعر ہیں۔

ڈاکٹر عالم خوند میری (۷ اگست ۱۹۷۷ء)

رؤف خیر کو یقیناً صالح جدیدیت کا علم دار کہا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری میں عقلیت *Rationality* کا عنصر بہت زیادہ

نمایاں ہے اور بہت کم ادیب ہوتے ہیں جو ادب میں عقلیت کو اہمیت دیتے ہیں اور اسے برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔
 رُوف خیر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اسے سلیقے سے پڑھا اور اپنی انفرادیت دکھائی۔ رُوف خیر کی شاعری میں احتجاج اور بغاوت صرف اک کرب کی صورت میں نہیں بلکہ تہذیبِ فن کے ساتھ ہیں جو بہت کم شاعروں اور ادیبوں کے حصے میں آتا ہے۔ انہوں نے مذہبِ اسلام کی بعض تلمیحات کو اپنے دور پر منطبق کر کے اپنی عصری حیثیت کو ایک چونکا دینے والا لہجہ دیا۔ یہی ان کی شاعری کا ایک دھنچکا خاص ہے۔

ڈاکٹر مظنی تبسم (۷ اگست ۱۹۷۷ء)
 اگر ”اقرا“ شائع نہ ہوتا تو ہماری دانشورانہ زندگی میں اک کئی کسی محسوس کی جاتی۔

مصلح الدین سعودی (۷ اگست ۱۹۷۷ء)
 رُوف خیر نے نئی نئی تراکیب کے ذریعے اردو ادب کو املا مال کیا ہے۔ ان کے زبان کے تجربے اپنی جدولی معنویت کے اعتبار

سے ادبی ماحول میں یقیناً الگ الگ مقام رکھتے ہیں۔

غزنی قیسی (۱۹۷۷ء)

آپ کا مجموعہ کلام ”اقرا“ ملا۔ اور ایک ہی نشست میں اس کی قرائت بھی میں نے کر لی۔ مثنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس لائق سمجھا دیتے اہل حیدر آباد تو مجھے اپنا سمجھ کر ”پتھوں“ بھیا ہی سلوک کرتے ہیں۔

آپ کی شاعری متاثر کرتی ہے۔ اور یہی ایک وصف بہت غنیمت ہے اس زمانے میں۔ تفصیلی رائے نہ آپ نے مانگی نہ میں اپنے آپ میں اتنا وقوف محسوس کرتا ہوں کہ دوں۔ پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمارے بعد اس شہر میں آپ ہی اٹھے آپ کی شاعری میں بڑی توصیف سے پڑھ رہا ہوں آپ دن بدن ~~سودھ~~ ^{سودھ} کر رہے ہیں خوشی ہو رہی ہے۔

اظہار (۱۹۷۷ء) سلمیٰ جاوید میٹیر ریورٹینر۔

ہے خیر کے کلام میں کس درجہ سوز و ساز	جذبِ دروں کو خالقِ اقرا سے پوچھیے
پڑھ کر خلوصِ قلب سے ہوتا ہے دل گداز	ہے خیر کے کلام میں کس درجہ سوز و ساز
کتنا حقیقتوں سے قریب آگیا مجاز	لطفِ سخی جو ہے دل سلمیٰ سے پوچھیے
ہے خیر کے کلام میں کس درجہ سوز و ساز	جذبِ دروں کو خالقِ اقرا سے پوچھیے

ڈاکٹر سلیمان اظہر جاوید (۲۰ دسمبر ۱۹۷۷ء)

میں نے ہمیشہ ہی آپ کا کلام دلچسپی اور توجہ سے پڑھ لیا ہے۔ اور محفوظ ہوا ہوں۔ ادھر جو شاعری غزل میں اپنی آواز بنا رہے ہیں، بنا چکے ہیں آپ ان میں سے ایک ہیں۔ آپ کے ہاں غزل کے نئے پن کے ساتھ روایات کا پاس اور احترام بھی ہے۔ الفاظ کی تراش خراش میں ندرت، نکھرے نکھرے مصرعے، تشبیہات و استعارات میں دلنوازی، گہری معنویت، فکر انگیزی اور بحیثیت مجموعی غزل نگاری کا یہ تیکھا تیکھا انداز، یہ ڈکشن، روایت کے صحیح اور صحتمند احساس و ادراک کے بغیر ممکن نہیں۔ اردو شاعری کے لئے یہ فالِ نیک ہے۔ آپ کی منظومات (بشمول تراکیب) بھی ایک بانچن لئے ہوئے ہیں۔ بیشتر نظموں میں عصری زندگی اور اس کے مسائل کی جھلک، خاصی عمرگی سے ملتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کلماتِ خیر

فرانسیسی صنفِ سخن "ترائیٹے" اردو میں بہت کم شاعروں نے اپنائے۔ حتیٰ کہ نریش کمار شاد جیسے ہر فن مولا قسم کے آدمی نے بھی صرف تفریحِ طبع کے طور پر ہی "ترائیٹے" کہے۔ شاید اس کا سبب ترائیٹے کے مصرعوں کا وہ دہراؤ ہے جو فنی رچاؤ کی کمی کے باعث پڑھنے اور سننے والے کو بارگزر سکنا ہے۔ یہ آٹھ مصرعوں کی چھوٹی سی نظم بڑی خاص توجہ چاہتی ہے۔ مصرعوں کی ترتیب و آہنگ کا خیال رکھنا آج کل اذیت کوئی کے مترادف سمجھا جانے لگا ہے۔ کیونکہ پانچ نظم سے آزاد و معرا نظم، غزل سے آزاد غزل اور پھر نثری نظم تک جو سسر ادب نے طے کیا ہے وہ پانچویں سے آزاد یوں کی نظر سفر کی علامت ہے ایسے میں آٹھ مصرعوں کا التزام اور پھر دو مصرعوں کا خاص ترتیب کے ساتھ دہراؤ ممکن ہے اچھا نہ لگے۔ مگر اس کا

کیا کیا جائے کہ تراٹیلے میں مراجی لگ گیا۔ چنانچہ میں نے بے شمار تراٹیلے کہے۔ کچھ "اقرا" میں تھے اور اب حملہ تراٹیلوں کا ایک انتخاب "ایلاف" کے نام سے پیش ہے۔

"تراٹیلے" کی تاریخ دہرانے کی یہاں میں چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ فرانس میں کس کس نے لکھے، انگریزی میں کس نے لکھے اٹلی میں کن شاعروں نے اپنا یا فارسی میں کن شاعروں نے اسے روشناس کر دیا اور پھر اردو میں کس طرح یہ صنف درآئی۔ اتنا ضرور ہے۔ ابتداء میں اچھے تراٹیلے نریش کمار شاد نے لکھے پھر یہ صنف میں نے سنجیدگی سے اپنا ہی جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ اس میں شک نہیں فرحت کیفی مرحوم نے بھی تراٹیلے کہے اور اپنا ایک مجموعہ "پتہ پتہ بوٹا بوٹا" بھی دیا۔ اس لحاظ سے میرا مجموعہ "ایلاف" تراٹیلوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ ہے۔

امید کہ مری یہ کاوشیں نگاہ اعتبار میں کسی قابل ضرور ٹھہریں گی۔ اس مجموعے کی اشاعت کے لئے ادارہ "گل ٹوٹے" نے جس پُر خلوص تنگ و دو کا مظاہرہ کیا اس کے بغیر اس کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

رؤف خیر

۵ نومبر ۱۹۷۹ء

شرايط

آئس برگ

۲ جون ۱۹۷۸ء

۱

مجھے کچھ لوگ ہی پہچانتے ہیں
 بظاہر برف کا تودہ ہوں لیکن
 مری قیمت بہت کم جانتے ہیں
 مجھے کچھ لوگ ہی پہچانتے ہیں
 جو امت بھی مجھے گردانتے ہیں
 مری خاطر لگے گی آگ اک دن
 مجھے کچھ لوگ ہی پہچانتے ہیں
 بظاہر برف کا تودہ ہوں لیکن.....

۲

میں بے مصرف بظاہر بے سبب ہوں
 مگر میرا زمانے پر — تصرف
 میں خاک و باد و آتش اب سب ہوں
 میں بے مصرف بظاہر بے سبب ہوں
 تمہاری راہ کی دیوار کب ہوں
 تمہیں خوش آئیگا میرا تعارف
 میں بے مصرف بظاہر بے سبب ہوں
 مگر میرا زمانے پر — تصرف

۳

زلیخاؤں میں ہوں دامن سلامت
 سر اسر یوسف دامنِ تر ہوں
 ہے دامن پھاڑنے کی کیا ضرورت
 زلیخاؤں میں ہوں دامن سلامت
 کسی کو بھی نہیں مجھ سے شکایت
 میں سب کے حق میں اک پیمانِ تر ہوں
 زلیخاؤں میں ہوں دامن سلامت
 سر اسر یوسف دامنِ تر ہوں

۴

جو ممکن ہو تو ہو تقسیم لیکن
 مری تشکیل تو ممکن نہیں ہے
 بکھر جانا مقدر ہے ہی اک دن
 جو ممکن ہو تو ہو تقسیم لیکن
 میں ہوں احساں فراموشوں کا محسن
 مری تمثیل تو ممکن نہیں ہے
 جو ممکن ہو تو ہو تقسیم لیکن
 مری تشکیل تو ممکن نہیں ہے

۵

مرے باہر بلا کی آندھیاں ہیں
 مرے اندر سکونِ خواب جیسا
 ثمر آدر وہ جوہر آبیاں ہیں
 مرے باہر بلا کی آندھیاں ہیں
 مرے شہد اب سے سیرابیاں ہیں
 خرابہ، بستیِ شا داب جیسا
 مرے باہر بلا کی آندھیاں ہیں
 مرے اندر سکونِ خواب جیسا

کرم کرنے پہ ہوں میں کب سے مائل
 بقول اقبال کوئی تو ہو سائل
 مری ہستی نہ ہو قاروں شائل
 کرم کرنے پہ ہوں میں کب سے مائل
 زمین و آسماں ہیں میرے قائل
 الگ ہیں تم سے کب میرے مسائل
 کرم کرنے پہ ہوں میں کب سے مائل
 بقول اقبال کوئی تو ہو سائل

دیوار (اپنے اکلوتے بھائی کے نام)

ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
 ایک ہی شہر میں رہتے ہیں نہ رہنے کی طرح
 اتنا بودا تو نہ تھا خون کا رشتہ اپنا
 ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
 اپنی اپنی ہے خوشی، درد ہے اپنا اپنا
 ہم ہوئے شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح
 ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
 ایک ہی شہر میں رہتے ہیں نہ رہنے کی طرح

۱۱ اگست ۱۹۷۸ء

ٹائم کیپسول

بنو اُمیہ ہی باقی نہ ہے بنو عباس
 نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ
 ہوا و حرص بھلا گس کو آسکے ہیں راس
 بنو اُمیہ ہی باقی نہ ہے بنو عباس
 سروں میں دفن ہوئی اقتدار کی بو، باس
 ہر ایک حرفِ ہوس پر کھنچا خطِ تثنیخ
 بنو اُمیہ ہی باقی نہ ہے بنو عباس
 نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ

اعراف

میں جہاں ہوں وہاں اوس و خمر ج بھی ہیں
 ایک آواز حق بھی ، سمیٹہ بھی ہے
 گھر کے آنگن ابو جہل کے کچ بھی ہیں
 میں جہاں ہوں وہاں اوس و خمر ج بھی ہیں
 چور ، زانی ، شرابی ہیں اور ج بھی ہیں
 میں ہوں سب کے الگ سب کے رشتہ بھی ہے
 میں جہاں ہوں وہاں اوس و خمر ج بھی ہیں
 ایک آواز حق بھی ، سمیٹہ بھی ہے

رشتہ

آتا ہے رہ رہ کے چہرے کا خیال
 پمھلیاں، ہفتہ، سمت در بے کنار
 خشک لب آنکھوں میں اک جلتا سوال
 آتا ہے رہ رہ کے چہرے کا خیال
 دستِ خالی میں لکھا ہے گھر کا حال
 دم بخود ہوں درمیانِ نور و نار
 آتا ہے رہ رہ کے چہرے کا خیال
 پمھلیاں، ہفتہ، سمت در بے کنار

ٹرمپ کارڈ

کوئی حربہ ہو، اب پرکھ دیکھو
آخری پیر میرے ترکش کا
سرِ تھیلی پہ اپنا رکھ دیکھو
کوئی حربہ ہو، اب پرکھ دیکھو
نہ ہر کا ذائقہ نہ چکھ دیکھو
توڑ دے گا غور سے کش کا
کوئی حربہ ہو، اب پرکھ دیکھو
آخری پیر میرے ترکش کا

عرفان کے بعد

چاند سے راہ کیجئے معلوم
 اور سورج سے حال موسم کا
 اسکی آنکھیں نہیں رہیں منصوم
 چاند سے راہ کیجئے معلوم
 اسکے لہجے میں ڈھونڈیئے مفہوم
 رنگ کچھ اور ہی ہے ظالم کا
 چاند سے راہ کیجئے معلوم
 اور سورج سے حال موسم کا

۳۱ جنوری ۷۹ء

شہ مات

پندار ٹوٹنا ہے الثنا بباط کا
 یوں بھی ہوا کہ پیادوں سے شہ مات ہو گئی
 اک مہرہ غلط ہے سبب انحطاط کا
 پندار ٹوٹنا ہے الثنا بباط کا
 کتنا کٹھن رہا ہے سفر احتیاط کا
 دوست اطروں سے کتنی بڑی بات ہو گئی
 پندار ٹوٹنا ہے الثنا بباط کا
 یوں بھی ہوا کہ پیادوں سے شہ مات ہو گئی

۲۲ جولائی ۱۹۷۸ء

”بن باس“

مجھے گدی تو اک دن چھوڑنی ہے
 یہ کیوں بن باس پر بھیجا گیا ہوں
 مری ہمدرد کیسی کیسی ہے
 مجھے گدی تو اک دن چھوڑنی ہے
 ہمارا راجہ تو بس مجبور بھی ہے
 میں اب خشک کا راجہ ہو چکا ہوں
 مجھے گدی تو اک دن چھوڑنی ہے
 یہ کیوں بن باس پر بھیجا گیا ہوں

”کارِ جہاں دراز ہے“

آدمی بر سرِ بغاوت ہے
 قرارِ ذل سے قصرِ احسن تک
 فاصلہ یوں تو بے نہایت ہے
 آدمی بر سرِ بغاوت ہے
 سر سے پا تک جوازِ محنت ہے
 من و سلویٰ سے پیازِ احسن تک
 آدمی بر سرِ بغاوت ہے
 قرارِ ذل سے قصرِ احسن تک

زنگ ماسٹر

نہ جائے ماندن نہ پائے رشتن
 کہ ہم تو سسکس کے جانور ہیں
 اشارہ تمازا یا نہ ہے فن
 نہ جائے ماندن نہ پائے رشتن
 یہ سب ریاکاریوں کا مامن
 یہ ہم اداکار بے نگر ہیں
 نہ جائے ماندن نہ پائے رشتن
 کہ ہم تو سسکس کے جانور ہیں

۲ فروری ۱۹۷۹ء

جیتے جی

دیکھ کمانہ جائے ہے تری بے چہرہ سگری کا دکھ
 اے مرگِ ناشناختِ مرا نام پیش ہے
 (یہ کس غمِ سرب سے نہ اٹھا نہ زندگی کا دکھ)
 دیکھ کمانہ جائے ہے تری بے چہرہ سگری کا دکھ
 دیکھوں تو جیتے جی بھی کبھی خود کشی کا دکھ
 یہ زندگی تو اپنے لئے اک گنیش ہے
 دیکھ کمانہ جائے ہے تری بے چہرہ سگری کا دکھ
 اے مرگِ ناشناختِ مرا نام پیش ہے

۶۱۹۷۸

سیلاب کی بھینٹ

اے عسکروج بے جہمی اے زوال رو پوشی
 لے مالتھوزین تھیوری تھی کہ مرگِ سرگوشی
 وہ زبانِ سیلابی اور آدمی نوشی
 اے عسکروج بے جہمی اے زوال رو پوشی
 بچ گئے تو ٹھیرا یا سب نے نوح کو دوشی
 ایک دن کی تنخواہیں دو منٹ کی خاموشی
 اے عسکروج بے جہمی اے زوال رو پوشی
 مالتھوزین تھیوری تھی کہ مرگِ سرگوشی

زمین کا ربط

زمین کا ربط زمان و مکان میں حائل ہے
 وگرنہ لطفِ سفر بے گھری میں کیا کیا تھا
 یہ اک تعلقِ خاطر کہ جاں میں حائل ہے
 زمین کا ربط زمان و مکان میں حائل ہے
 یہ نفس بھی ہے عجب 'دو جہاں' میں حائل ہے
 سکونِ دل کو اسی بے سری میں کیا کیا تھا
 زمین کا ربط زبانِ مکان میں حائل ہے
 وگرنہ لطفِ سفر بے گھری میں کیا کیا تھا

حکارتہ

وہ پھر ایک شیرے کا قطرہ ہے دیوار پر
 وہ پھر اسکی جانب کھسکتی ہوئی چھپکلی
 جھپٹی وہ بلی شکارِ نمودار — پر
 وہ پھر ایک شیرے کا قطرہ ہے دیوار پر
 وہ بلی پہ غراتا کتا اگر احسار پر
 لگا شہر میں کمرہ فیو ایک بھگدڑ میچی
 وہ پھر ایک شیرے کا قطرہ ہے دیوار پر
 وہ پھر اسکی جانب کھسکتی ہوئی چھپکلی

۲۹ مئی ۱۹۷۹ء

بازی گھر

بادشاہوں، بیگموں اور جوکروں میں رہ گئے
 تم نے کاٹا کر فیو کا وقت رمی کھیلتے
 ہائے کتنے باحیات تھے، مسخروں میں رہ گئے
 بادشاہوں، بیگموں اور جوکروں میں رہ گئے
 کتنے صندل سے بدن جلتے گھروں میں رہ گئے
 کھیلنا ہی تھا تمہیں تو جاں کی بازی کھیلتے
 بادشاہوں، بیگموں اور جوکروں میں رہ گئے
 تم نے کاٹا کر فیو کا وقت رمی کھیلتے

یکم اگست ۱۹۷۸ء

گھس

ترے وجود میں لوٹ آئے ہم تو بھول گئے
 وہ ایک اکسم کہ کھلتے ہیں جس سے دروازے
 ملی جو چشمِ فسون ساز، رم تو بھول گئے
 ترے وجود میں لوٹ آئے ہم تو بھول گئے
 سفالی جسم ملا، جامِ جم تو بھول گئے
 غلط نہ ہیں نگہ، کم سخن کے اندازے
 ترے وجود میں لوٹ آئے ہم تو بھول گئے
 وہ ایک اکسم کہ کھلتے ہیں جس سے دروازے

۱۰ اگست ۱۹۷۹ء

عَلَّمَ بِالْقَوْلِ

وہ اے بی کسی ڈی ہو کہ ہو گنتی کا سلسلہ
 ہر بے سفید چیز پہ لکھتی ہے چاک سے
 ایلاف خیری جانے لگی جب سے مدرسہ
 وہ اے بی کسی ڈی ہو کہ ہو گنتی کا سلسلہ
 ہر لفظ چیخ چیخ کے کرنے لگی ادا
 پڑھتی ہے ہاتھ باندھ کے اور کس تپاک سے
 وہ اے بی کسی ڈی ہو کہ ہو گنتی کا سلسلہ
 ہر بے سفید چیز پہ لکھتی ہے چاک سے

اہم کردار

سب سمجھتا ہوں کوئی بچہ نہیں
 میں ڈرامے کا اہم کردار ہوں
 میرے آگے پیچھے اب کیا نہیں
 سب سمجھتا ہوں کوئی بچہ نہیں
 کار کا میں پانسچواں پہنہ نہیں
 جیت ہوں اپنی جگہ یا ہار ہوں
 سب سمجھتا ہوں کوئی بچہ نہیں
 میں ڈرامے کا اہم کردار ہوں

خاموش تماشائی

نہ میں عکسب ہوں نہ دنیا کا غم ہے میرے لیے
 حقیقتاً ہوں میں سرتاپا گوشِ برآواز
 خوشی یہی ہے کہ اتنا سا غم ہے میرے لیے
 نہ میں عکسب ہوں نہ دنیا کا غم ہے میرے لیے
 میری خاموشی ہی گویا بھکم ہے میرے لیے
 نہ لاسکے گا کوئی میری بات کا انداز
 نہ میں عکسب ہوں نہ دنیا کا غم ہے میرے لیے
 حقیقتاً ہوں میں سرتاپا گوشِ برآواز

میٹھی گولیاں

ہم تو سمجھ رہے تھے کہ میٹھی ہیں گولیاں
 اتنی خبر نہ تھی ہمیں، کوکین ان میں ہے
 لگتی تھیں دیکھنے میں تو پیاری نمبولیاں
 ہم تو سمجھ رہے تھے کہ میٹھی ہیں گولیاں
 کن بولیوں میں کھیلی ہیں یاروں نے ہولیاں
 چھٹتا ہوا سا جذبہ کنگین ان میں ہے
 ہم تو سمجھ رہے تھے کہ میٹھی ہیں گولیاں
 اتنی خبر نہ تھی ہمیں، کوکین ان میں ہے

No Man's Land

یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
 اس سے اپنا کیسا کوئی رشتہ نہیں ہے
 یہ ہمارے ہاتھ کا لکھ نہیں ہے
 یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
 اس کا ہونا پھر کبھی کیا ہونا نہیں ہے
 اس کی ماں بے شک کوئی سیتا نہیں ہے
 یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
 اس سے اپنا کیسا کوئی رشتہ نہیں ہے

Hang Over

سنبولا دودھ پیتے پیتے اک دن
 لہو انسان کا پینے لگا تھا
 لہو کا نشہ زہر بلا تھا لیکن
 سنبولا دودھ پیتے پیتے اک دن
 جو پہنچا — تا سوادِ حد ممکن
 سوانیزے پہ سورج اگیا تھا
 سنبولا دودھ پیتے پیتے اک دن
 لہو انسان کا پینے لگا تھا

کوہِ نِدا

آج لو پھرسر وہ دس بج گئے
 ہم چلے دستروں کی طرف سے
 بدحواسی میں ہم سبج گئے
 آج لو پھرسر وہ دس بج گئے
 خواب دہلیسر پر تج گئے
 پھکرنہ دیکھسا گھروں کی طرف سے
 آج لو پھرسر وہ دس بج گئے
 ہم چلے دستروں کی طرف سے

ارتکاز

لہو کا بہنا تو ہے ارتکا زحباں کی نفی
 لہو جے تو کہیں کوئی شکل ابھسے گی
 ثباتِ حرفِ یقیں ہو تو ہو گماں کی نفی
 لہو کا بہنا تو ہے ارتکا زحباں کی نفی
 خبر یہ آئے کہیں سے ہوئی زیاں کی نفی
 سواری خیمہ گل میں کسی کی ٹھہرے گی
 لہو کا بہنا تو ہے ارتکا زحباں کی نفی
 لہو جے تر کہیں کوئی شکل ابھسے گی

نومبر ۱۹۷۹ء

چلکا

مرے اندر اندھیرا ہی اندھیرا
 تمہاری ذات چلکا نور کا ہے
 جدھر دیکھو ہے سناٹا گنہیرا
 مرے اندر اندھیرا ہی اندھیرا
 زمانے بھر کی الجھن کا ہے ڈیرا
 مگر ڈیرے میں اک سوراخ سا ہے
 مرے اندر اندھیرا ہی اندھیرا
 تمہاری ذات چلکا نور کا ہے

بندگی

میں عمر و عشق کی اس رہگذر میں ایک ہی ہوں
 یہ جانتے ہوئے آگے ہے راستہ مسدود
 میں ہار جیت کا قائل ہوں صلح کیسے کروں
 میں عمر و عشق کی اس رہگذر میں ایک ہی ہوں
 جہاں سے لوٹنا چاہوں تو لوٹ بھی نہ سکوں
 نفس کی ڈور ہے سلگی ہوئی بدن یا رود
 میں عمر و عشق کی اس رہگذر میں ایک ہی ہوں
 یہ جانتے ہوئے آگے ہے راستہ مسدود

انقلاب

عکس ہوس ہے آنکھ پر خاک ہے آفتاب پر
 دیکھوں تو آسمان پر کتنی سیاہی اور ہے
 وقت وہ سازگار تھا یہ تو فضا ہی اور ہے
 دیکھوں تو آسمان پر کتنی سیاہی اور ہے
 وہ جو شریکِ جرم تھا اسکی گواہی اور ہے
 اندھی ہے یوں بھی منصفی حیراں ہوں انقلاب پر
 عکس ہوس ہے آنکھ پر خاک ہے آفتاب پر
 دیکھوں تو آسمان پر کتنی سیاہی اور ہے

بلیف

بے گنا ہوں کو سزا دینی پڑی ہے
 ہم بھی کن ہاتھوں کے تپھر ہو گئے ہیں
 کیا اذیت ہے جو سہہ لینی پڑی ہے
 بے گنا ہوں کو سزا دینی پڑی ہے
 ناؤ منجھڑھاروں میں بھی کھینی پڑی ہے
 ہم ہوا، لنگر، سمن در ہو گئے ہے
 بے گنا ہوں کو سزا دینی پڑی ہے
 ہم بھی کن ہاتھوں کے تپھر ہو گئے ہیں

گواہِ برگشتہ

اُسی سے آس تھی جو ہے گواہِ برگشتہ
 میں بے گناہ تو انصاف کا شکار بھی تھا
 نہ جانے کس لئے سچائی سے گریزاں تھا
 اُسی سے آس تھی جو ہے گواہِ برگشتہ
 اُسے معاف کیا میں نے خونبہا اپنا
 ہزار کچھ سہی وہ شخص اپنا یا رہی تھا
 اُسی سے آس تھی جو ہے گواہِ برگشتہ
 میں بے گناہ تو انصاف کا شکار بھی تھا

۶۱۰۹۹

..... سرگرائی اور ہے

شوق پڑھنے کا بہت تھا تو کتابیں کمیاب
 وقت ارزاں ہو تو پھر جاں پہ گراں ہوتا ہے
 چہرہ چہرہ میں پایا کرتا ہوں تازہ زہر اب
 شوق پڑھنے کا بہت تھا تو کتابیں کمیاب
 اب مکر اس کتاب میں تو ہیں بے حد و حساب
 جنکے پڑھنے کو مگر وقت کہاں ہوتا ہے
 شوق پڑھنے کا بہت تھا تو کتابیں کمیاب
 وقت ارزاں ہو تو پھر جاں پہ گراں ہوتا ہے

دورِ ما

ہم پھر قریب آ کے بہت دور ہو گئے
 تم میں جو ہے وہ اپنی انا کا شکار ہے
 میں نار ہو گیا ہوں کہ تم نور ہو گئے
 ہم پھر قریب آ کے بہت دور ہو گئے
 مجھ میں ہزار طرح کے ناسور ہو گئے
 مجھ سے پرے رہو یہ تمہیں اختیار ہے
 ہم پھر قریب آ کے بہت دور ہو گئے
 تم میں جو ہے وہ اپنی انا کا شکار ہے

درد

ترا خیال ہے اک پیرِ تسمہ پا مجھکو
 تجھے خبر بھی ہے کیا کیا میں پی ذات سے تھا
 وہ دشتِ گمشدگی نے نگل لیا مجھکو
 ترا خیال ہے اک پیرِ تسمہ پا مجھکو
 کہوں میں کس سے خدا را ذرا بچا مجھکو
 لہو لہان میں یہ کیسے تجربات سے تھا
 ترا خیال ہے اک پیرِ تسمہ پا مجھکو
 تجھے خبر بھی ہے کیا کیا میں پی ذات سے تھا

۱۹۷۳ء

احساس

تمہارے قریبے ابھری ہیں، دوریاں کیا کیا
 میں کھو گیا ہوں کہ یہ حادثہ بھی ہونا تھا
 تمہیں خبر ہے ہوا ذہن کا زیاں کیا کیا
 تمہارے قریبے ابھری ہیں، دوریاں کیا کیا
 چھپی ہیں پائے تجسّس میں کہ چیاں کیا کیا
 شکستِ ذات کا یہ تجربہ بھی ہونا تھا
 تمہارے قریبے ابھری ہیں، دوریاں کیا کیا
 میں کھو گیا ہوں کہ یہ حادثہ بھی ہونا تھا

۶۱۹۷۲

مصالحات

تراخلوص مری روح سے گزر نہ سکا
 مراخلوص بھی اجسم کا تقاضہ ہے
 ترے سلوک سے احساسِ دردِ مر نہ سکا
 تراخلوص مری روح سے گزر نہ سکا
 میں نی پیاس کا تجھ سے گلہ بھی کر نہ سکا
 مصالحات کا بھی شاید ہی طریقہ ہے
 تراخلوص مری روح سے گزر نہ سکا
 مراخلوص بھی اجسم کا تقاضہ ہے

نتلی

کچے رنگوں سے بنائی ہوئی تصویر ہے تو
 مجھکو یہ ضد کہ ترے لمس کی لذت بھی ملے
 ایک دیوار پہ لکھی ہوئی تحریر ہے تو
 کچے رنگوں سے بنائی ہوئی تصویر ہے تو
 کوئی نتلی ہے کہ بیگانہ تعمیر ہے تو
 رنگ ہی رنگ کر دوں کیا تری صورت بھی ملے
 کچے رنگوں سے بنائی ہوئی تصویر ہے تو
 مجھکو یہ ضد کہ ترے لمس کی لذت بھی ملے

ہائی جاگ

یہ کس بدن میں اتارا گیا مجھے لا کے
 یہ کون مجھ میں چھپا تھا حرفِ نیا محسوس
 بنے تھے کیا کیا نہ میں نے حیات کے خاکے
 یہ کس بدن میں اتارا گیا مجھے لا کے
 یہ کون ہے جو مجھے یہ غماں ٹھہرا کے
 ہوا ہے میری طرح اپنے آپ سے مایوس
 یہ کس بدن میں اتارا گیا مجھے لا کے
 یہ کون مجھ میں چھپا تھا حرفِ نیا محسوس

نومبر ۱۹۷۹ء

آشوبِ چشم

بہت دنوں میں پکارا تری ہلک نے مجھے
 کہ اب تو چھوٹ گیا آئینے سے بھی پارا
 گئی تھی چھوڑ کے دن رات راہ تکنتے مجھے
 بہت دنوں میں پکارا تری ہلک نے مجھے
 مثال طور جلایا تری جھلک نے مجھے
 تو میکے آئی، میں آشوبِ چشم کا مارا
 بہت دنوں میں پکارا تری ہلک نے مجھے
 کہ اب تو چھوٹ گیا آئینے سے بھی پارا

۶۱۹۷۳

تعارف

میں وہ نہیں ہوں کہ جبکی تلاش میں تم ہو
 مگر میں وہ ہوں، تمہاری تلاش تھی جسکو
 عجیب فلسفہ بود باش میں تم ہو
 میں وہ نہیں ہوں کہ جبکی تلاش میں تم ہو
 یہ کیسے آئینہ پاش پاش میں تم ہو
 مگر میں وہ ہوں کہ دنیا بھی تاش تھی جسکو
 میں وہ نہیں ہوں کہ جبکی تلاش میں تم ہو
 مگر میں وہ ہوں تمہاری تلاش تھی جسکو

۱۹۷۲ء

بے پارہ اعلیٰ

وہ ساتھ ہے کہ جس سے تعارف نہیں کوئی
 جانے کہاں ہے وہ جو دعا کا شریک تھا
 سچ ہے کہ اب محلِ تأسف نہیں کوئی
 وہ ساتھ ہے کہ جس سے تعارف نہیں کوئی
 یہ بھی درست ہے کہ میں یوسف نہیں کوئی
 وہ خوش ادا تو بن کے زلیخا شریک تھا
 وہ ساتھ ہے کہ جس سے تعارف نہیں کوئی
 جانے کہاں ہے وہ جو دعا کا شریک تھا

پس و پیش

مجھے گھر لوٹ جانا چاہئے تھا
 (مگر اب لوٹ کر بھی کیا کروں گا؟)
 یہی نا آب و دانہ چاہئے تھا
 مجھے گھر لوٹ جانا چاہئے تھا
 تھکن میں کچھ ٹھکانا چاہئے تھا
 کہیں سائے میں رک جایا کروں گا
 مجھے گھر لوٹ جانا چاہئے تھا
 (مگر اب لوٹ کر بھی کیا کروں گا؟)

۲۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء

امانت

اپنا کردار ترے قرب کے لمحوں کیلئے
 اک امانت کی طرح میں نے اٹھا رکھا ہے
 پیاس لک عمر کی ترسے تری آنکھوں کیلئے
 اپنا کردار ترے قرب کے لمحوں کیلئے
 تیرے ہونٹوں ترے رخسار کے صفحوں کیلئے
 ایک ایک قطرہ جاں میں نے بچا رکھا ہے
 اپنا کردار ترے قرب کے لمحوں کیلئے
 اک امانت کی طرح میں نے اٹھا رکھا ہے

حالات

حالات خود بھی میرے موافق نہ تھے ابھی
 تم سے بھی انتظار کی زحمت نہ ہو سکی
 دل اتنی آرزوؤں کے خالق نہ تھے ابھی
 حالات خود بھی میرے موافق نہ تھے ابھی
 لمحے تمہارے قرب کے لائق نہ تھے ابھی
 اظہارِ آرزو کی جو جرات نہ ہو سکی
 حالات خود بھی میرے موافق نہ تھے ابھی
 تم سے بھی انتظار کی زحمت نہ ہو سکی

انجام کار

سوچا ہے تیری مانگ میں سیندور دیکھ کر
 اپنی ہتھیکلیوں کی لکیڑوں کو میٹ لوں
 غارِ کرائے زیت کو بے نور دیکھ کر
 سوچا ہے تیری مانگ میں سیندور دیکھ کر
 کرب و فا کو ضبط پہ محسوس دیکھ کر
 تسکین مانگتی ہوئی نظریں سمیٹ لوں
 سوچا ہے تیری مانگ میں سیندور دیکھ کر
 اپنی ہتھیکلیوں کی لکیڑوں کو میٹ لوں

محمد علی تاج بھوپالی

۱۳ اپریل ۱۹۷۸ء

۱

کاش پیے ذرا سلیقے سے
 کون کبخت روکتا تھا تمہیں
 اے چہیتے ذرا سلیقے سے
 کاش پیے ذرا سلیقے سے
 ہاے جیتے ذرا سلیقے سے
 میں بڑا تھا جو ٹوکتا تھا تمہیں
 کاش پیے ذرا سلیقے سے
 کون کبخت روکتا تھا تمہیں

وادی خار سے گزرتے ہوئے
 لہ خیمہ گل میں کاش رک جاتے
 رات بھر لمحہ لمحہ مرتے ہوئے
 وادی خار سے گزرتے ہوئے
 کاش تھکے ذرا سفر تے ہوئے
 کیوں صبا کی طرح سبک جاتے
 وادی خار سے گزرتے ہوئے
 خیمہ گل میں کاش رک جاتے

لہ ”خیمہ گل“ تاج صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ جی ۶۶ میں مچھال شائع ہوا

۳

اے "موت کتنی ہی شاندار ہے
 زندگی کا مگر جواب نہیں"
 دھیان رکھ اے زوال خوش نگہی
 موت کتنی ہی شاندار ہے
 یاد اس کی رہی رہی نہ رہی
 آدمی گر خود احتساب نہیں
 موت کتنی ہی شاندار ہے
 زندگی کا مگر جواب نہیں

25th hour

۱۰ مئی ۱۹۸۰ء

کس ساعتِ شدید کے نرغے میں آگئے
 ہر چیز دائرے سے نکلتی ہوئی سی ہے
 جنگل کے جتنے شیر تھے پھرے میں آگئے
 کس ساعتِ شدید کے نرغے میں آگئے
 یہ کس ڈگر پہ جاگتے سوتے ہیں آگئے
 جو شکل حریرِ جاں تھی وہی اجنبی سی ہے
 کس ساعتِ شدید کے نرغے میں آگئے
 ہر چیز دائرے سے نکلتی ہوئی سی ہے

بے مکانی

۲۵ مئی ۱۹۸۰ء

اس خاک سے ہزار یونہی جی لگائیے
 بے آسمان کر کے رہیگی زمین تو
 ہر چہ سو طرح کا تعلق نبھائیے
 اس خاک سے ہزار یونہی جی لگائیے
 مٹی سے ہاتھ، ہاتھ سے مٹی چھڑائیے
 ہے بے مکانیوں سے ہی شانِ مکیں تو
 اس خاک سے ہزار یونہی جی لگائیے
 بے آسمان کر کے رہیگی زمین تو

سفید ہاتھی

۱۶ جون ۱۹۸۰ء

میں کس غلامی میں پھنس گیا ہوں
 چھچھوند رٹا نپ کے دہن میں
 نہ چھوٹی ہے نہ چھوڑتا ہوں
 میں کس غلامی میں پھنس گیا ہوں
 ضمیر پر کب سے ہنس رہا ہوں
 سفید ہاتھی کے پیرہن میں
 میں کس غلامی میں پھنس گیا ہوں
 چھچھوند رٹا نپ کے دہن میں

Wrong Court

جون ۸۱ ۱۹۶۱ء

یہ کس کا در کھٹکھٹا رہا ہوں
 سڑے ہوئے گوشت کی طلب میں
 یہ کس کی دہلیز پہ کھڑا ہوں
 یہ کس کا در کھٹکھٹا رہا ہوں
 عجب ہوس رنگِ ذائقہ ہوں
 الجھ گیا ہوں جو روز و شب میں
 یہ کس کا در کھٹکھٹا رہا ہوں
 سڑے ہوئے گوشت کی طلب میں

نغمہ نوا

کبھی کبھی تو یہی سوچ کر ہوئے خاموش
 زمینِ شور میں کیا تخم بے نوا بوئیں —
 نمو کے خواب سے بوجھل ہے چشمِ خوش آغوش
 کبھی کبھی تو یہی سوچ کر ہوئے خاموش
 زمینِ خود کو سمجھتی رہے ذرا نردوش
 ہم اپنا نقش بھی ریگاب میں کہاں کھوئیں
 کبھی کبھی تو یہی سوچ کر ہوئے خاموش
 زمینِ شور میں کیا تخم بے نوا بوئیں —

حرفِ ناگفتہ

۱۸ ستمبر ۱۹۷۸ء

ادب کے نام پہ کیا رہ گیا ہے کہنے کو
مگر وہ بات جو میں چپ رہوں تو رہ جائے

یہ حرف و صوت کا دھارا بہت ہے بہنے کو
ادب کے نام پہ کیا رہ گیا ہے کہنے کو

یہ گھاس پھوس کا چھپر بہتا ہے رتنے کو
مگر وہ آگ جو مجھ میں ہے کس جگہ جائے

ادب کے نام پہ کیا رہ گیا ہے کہنے کو
مگر وہ بات جو میں چپ رہوں تو رہ جائے

قطع کلام معاف ...

غرض کہ ناصرف اس قدر ہے کہ اول ارادہ تھا صرف تراٹیلوں پر مشتمل مجموعہ پیش کرنے کا۔ اسی خیال سے میرے دوست جمیل شیدائی کا مضمون صرف تراٹیلوں ہی کی حد تک، اس میں شامل بھی کیا گیا تھا۔ لیکن بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے یہ مجموعہ وقت پر شائع نہ ہو سکا اس لیے اس مرحلے پر اس میں نظمیں اور غزلیں بھی شامل کر لی گئیں۔

”اقرا“ کے بعد یہ دوسرا مجموعہ ”ایلاف“ پیش خدمت ہے۔ انور نظامی نے اس کی کتابت ابو ظہبی سے کر کے بھجی اور محمود سلیم صاحب نے تصحیح، ٹائٹل، سب ٹائٹل اور جزوی کتابت سے نوازا۔ میں ان سب کا ممنون ہوں۔

امید کہ اربابِ نظر کو یہ دوسرا مجموعہ بھی پسند آئے گا۔ فقط

لالہ

(رؤف خیر)

نظمیں

نمؤ کا جوش سلامت میں بے نشان نہیں
کمال یہ ہے کہ ہر خاک نم ہے میرے لیے

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

۶ نومبر ۱۹۷۸ء

مرے جوتے میں پانی بھر گیا ہے
اور اک لمبا سفر درپیش ہے
ایہ رحمت پر مجھے رہ رہ کے غصہ آرہا ہے

اور ادھر میکہ ان طائف
خاک آلودہ تھے اندھے ہاتھ
بہر رہا تھا جب کسی فرقِ مبارک سے لہو
نعلین میں پائے مبارک جم گئے تھے
رحمتِ عالم کے ہونٹوں پر
مگر پھر بھی دعا تھی

ریگاب

۶ جنوری ۱۹۷۹ء

سمندر کے اس پار ریگاب تو ہے
 مگر یہ بھی سچ ہے
 تموہی نموہے
 میں بنجر زمینوں میں کیا بورا ہوں
 یہاں واقعی رالگاں ہو رہا ہوں

مردِ ناداں

۱۱ دسمبر ۱۹۷۷ء

مجھے تسلیم ہے ہیرے کے جگر سے نابلدہوں
 مگر یہ بھی تو دیکھو
 تمہارے ہاتھ میں بھی پھول کی پتی نہیں ہے

نئے سال کیلئے بھی

۱۴ دسمبر ۱۹۷۷ء

کوئی آئے
 کسی صورت
 کسی ساعت بھی آئے
 دستکیں لو مانہ دونگا
 جواب میں بہر صورت ملونگا

فریبِ تماشہ

۱۰ جولائی ۱۹۷۹ء

دے کے اخبار میں
اپنے مرنے کی جھوٹی خبر
جی میں آتا ہے دیکھوں کبھی
دوستوں، دشمنوں، رشتہ داروں کا رد عمل

اور پھر سبھی اٹھوں

خود غرض

۱۹ جون ۱۹۷۶ء

حادثے کی موت مر سکتا نہیں میں
 ایک چھوٹی سی دعا پڑھ کر نکلتا ہوں جو گھر سے
 سوئپ دیتا ہوں میں اپنے آپ کو دستِ خدا میں
 گھر سلامت جب پہنچ جاتا ہوں میں
 صبح تک پھر یاد آتا ہی نہیں
 شام تک جس نے حفاظت کی مری
 شام تک پھر یاد آتا ہی نہیں
 صبح جس کے نام پر نکلتا تھا میں

نا آشنا

۲۴ نومبر ۱۹۷۸ء

سنا ہے میرے ہمسائے کبھی بی نا آشنا مجھ سے
 مگر کس طرح پوچھیے ؟
 درحقیقت جانتے والے ہی کتنے ہیں ؟

تم کہاں کھو گئے

۲۸ اکتوبر ۱۹۷۸ء

تم کہاں کھو گئے ہو

مجھے لگ رہا ہے

میرے ٹائپ رائٹر کا اک حرف اسے (A)

نوٹ کر گر گیا ہے

کہیں کھو گیا ہے

تمہیں کچھ خبر ہے کہ اب میری تحریر

بے ربط سی ہو گئی ہے

تم کہاں کھو گئے ہو

شریفانہ معاہدہ

۶۱۹۷۳

چلو صلح کر لیں
 یہ جھگڑے انا کے
 یہ سب رنجشیں
 رنج و رخنہ گر و رائگاں ہیں

چلو آپ اپنی عدالت کے منصف بنیں
 شبہ کا فائدہ کچھ تمہیں بھی ملے
 شبہ کا فائدہ کچھ مجھے بھی ملے
 آدمی کی جبلت خرابی نہیں
 چلو صلح کر لیں

ہم تو مائل بہ کرم

۲۷ نومبر ۱۹۷۷ء

تم کوئی بچی نہیں ہے
آج بھی بس سکن اماں ہو کہ پونم

چاند کو پانے کی زیریں لہر رگ رگ میں ملے
تعالیٰ یا فی کا سوا سے
آسمان کی اور تکی جا رہی ہو

میں تمھاری گود میں چاند اور سورج ڈال سکتا ہوں
کہو کیا چاہتی ہو

تم کوئی بچی نہیں ہو

خیالِ رزق ہے.....

۱۲ نومبر ۱۹۷۸ء

منہ اندھیرے
 پڑ پڑا کر نیند سے جو نہی اٹھا ہوں
 دودھ کی بوتل کی خاطر
 ایک لمبی کیٹو میں ٹھیرا ہوا ہوں

تجربہ

۲۰ نومبر ۱۹۷۸ء

مجھے بچوں سے ایسی خاص دلچسپی نہیں تھی
 مگر میں باپ جب خود بن چکا ہوں
 تو ہرنچے پہ پیار آنے لگا ہے

ٹی وی، کرکٹ اور مکھی

۲۰ نومبر ۱۹۷۸ء

سہانے تھے بہت ٹی وی کے نظارے
 حصوں کو مجتمع کر دینے والا ایک ایک لمحہ
 وہ ہندوپاک کے مابین کرکٹ میاچ
 اور ایسے میں کہیں سے کوئی مکھی آکے ٹی وی سیٹ کے پردے پر
 گناہِ شرک کے دھبے کی صورت
 مستقل بیٹھی ہوئی

منظرِ منظر آنکھ پر بارگراں تھی
 ادھر فتح و ظفر میں خاک پر پشائیاں تھیں
 ادھر مکھی تھی ہر منظر میں شامل
 مرے ساتھی نے وہ مکھی نگلی لی
 اور پھر ٹی وی کا چہرہ صاف تھا

خود بینی

جنوری ۱۹۷۲ء

مرے کمرے میں آئینہ چڑا تھا
 اور اک چڑیا اسیر خود نمائی
 چلی آتی تھی روزانہ ہی اندر
 جو آئینے میں خود کو دیکھتی تھی
 تو آئینے پہ چونچیں مارتی تھی
 وہ چڑیا مستِ خود بینی بہت تھی
 کہیں نزدیک ہی بلی کھڑی تھی
 ذرا جھپکیں جو اس چڑیا کی آنکھیں
 چمک بلی کی آنکھوں میں سوا تھی
 کہ اس کے پنچے میں ننھی سی جاں تھی
 ان آنکھوں پر وہ منظر چھا گیا ہے
 مرے کمرے سے آئینہ گیا ہے

واقعہ سخت

۱۰ مئی ۱۹۷۸ء

موٹر سیکل لے کر حیب میں گھر سے نکلا
میری ننھی مٹی بیٹی نے یہ ضد کی
”پیا میں بھی ساتھ چلوں گی“

خو فرزدہ لہجے میں اس سے۔ میں نے کہا یہ
”میں تو آفس بھاگ رہا ہوں۔ تم مت آنا“

اس نے بھولے پن سے پوچھا
”کیوں پیا۔ کیا آفس میں بڈھا رہتا ہے“
سچ تو یہ ہے میں انکار نہیں کر پایا

نظم

۱۰ مارچ ۱۹۷۷ء

منہ اندھیرے روز چوکھٹ چھوڑتا ہوں
 فائلوں میں سکے کھپا کر
 رات کتنی دیر سے گھر لوٹتا ہوں
 ایک عرصے سے یہی معمول ہے

اپنی ننھی مٹی بٹی کی مناجاتیں
 وہ پیاری پیاری باتیں
 کب سنوں سینہ پھلا کر
 سوچتا ہوں!

فاعتبرو یا اولی الابصار

۲۴ نومبر ۱۹۷۸ء

میں ساؤن کا کوئی اندھا نہیں ہوں
 مری چشم تماشا میں تو ہے ہر رنگ غریاں
 سوائے اک ہرے کے

نظم

۲۲ جون ۱۹۷۶ء

ہائے کیا کیا لوگ تھے مانباپ کی خاطر
 کٹورا دودھ کالے کر
 کھڑے رہتے تھے ساری رات
 تاکہ آنکھ کھل جائے تو انکی نذر کر دیں

اور میری ماں
 مرے کمرے میں میرا کھانا رکھے
 رات کے پھلے پہر تک راہ تکتی ہے میری
 تاکہ اپنے لالہ ابالی پن کے کارن
 رات کو لوٹوں تو بھوکے پیٹ ہی میں سوتے جاؤں

قابیل

اٹھا کے دیکھئے شاہد ہے آج تک تاریخ
 کہ زندگی کا کوئی مرحلہ ہو
 بھائی کو شکست بھائی کے ہاتھوں ہوئی ہے
 کہ اتنی ویدہ دلیری
 پر اے خوں میں کہاں !

غزلیں

شہر میں اتنے پیارے ہم اپنی کس خوبی سے ہوے
قابلِ رشک و خوش قامت تیری محبوبی سے ہوے

بہت دنوں سے کچھ اپنا پتہ نہیں ملتا
کبھی تو چہرہ کبھی آئینہ نہیں ملتا

وہ آبِ جو 'ہوں کہ جس میں ہزار جہرے ہیں
تو تشنہ لب ہے کیوں مجھ سے آ نہیں ملتا

۲۹ جون ۱۹۷۷ء

میرے شریکِ جرم مرے یار تم بھی تھے
 میں پارسانہ تھا تو گنہگار تم بھی تھے
 کیا کیا ملال ہے کہ بکاؤ نہیں ہیں ہم
 اتنی خبر نہ تھی کہ خریدار تم بھی تھے
 سچ ہے کہ سود مند نہ تھی کچھ انا مری
 لیکن یہ واقعہ ہے زیاں کار تم بھی تھے
 اک نفسِ ناشناس تھا میں سر سے پاؤں تک
 اچھا ہوا کہ آئینہ بردار تم بھی تھے
 اتری نہ بام سے کبھی آوارگی مری
 میرے گواہ اے دردِ دیوار تم بھی تھے
 تم سے تو خیر کوئی شکایت نہیں مگر
 میں خوش گماں تھا اور ملنسار تم بھی تھے
 ہم تو صدِ البحرِا ہوئے خیر سارِ شأ
 تم کو ہوا تھا کیا لبِ اظہار تم بھی تھے

جولائی ۱۹۷۷ء

جس روپ میں بھی چلے تماشہ گرد رہو
اتنا ہوا اپنے ہونے کی پہچان تو رہو

بے خواب آسماں کا سفر بھی سرشت ہے

دم بھر خارِ خوابِ غنیمت ہے سو رہو — !

قاتل ہوں یا خضر ہوں کھلے گا یہ کس طرح

اے بدگمان لوگو مرے ساتھ تو رہو

ہر کشتِ جاں تو دانہ گندم پسند ہے

کاٹو گے رات گر کوئی سورج بھی بو رہو

مجھ سے گزر کے جاؤ اگر اختیار ہے

یا میرے ساتھ ساتھ مرے ہمدمو رہو

تعمیرِ آسماں کے لئے اس زمین — پہ

یوں جی ابھی بُرا نہ کر دے گھرو — رہو

دھند لا نہیں ہے کوئی بھی منتظرِ وقتِ خیر

بس اتنی شرط ہے کہ نہ آنکھیں بھگو رہو

۱۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء

ہزار تہنیتی بھی ملیں، گلے بھی ہوئے
 مری کتاب پہ دیک کے تبصرے بھی ہوئے
 خمارِ خواب کے بے خواب تجربے بھی ہوئے
 وہ دن بھی کیا تھے ترے نام رتجگے بھی ہوئے
 تمام جھوٹی آنا تھی یہی تو اک سچ ہے
 ہمیں تو ہونا تھا رسوا ترے لیے بھی ہوئے
 زمیں سے ربط مگر ٹوٹ ہی نہیں پاتا
 دراز اپنی اڑانوں کے سلسلے بھی ہوئے
 ہزار قرب کے پہلو تھے درمیان مگر
 پہاڑ جیسی روایت کے فاصلے بھی ہوئے
 رکے تو بادِ صبا سے بھی خوف آتا تھا
 چلے تو خیر ہواؤں کے سامنے بھی ہوئے

پنج ۱۹۷۸ء

کیا کیا نہ اس نواح میں ہم سے مچلے ہوئے
 قیرے لئے بنائے گئے تھے ترے ہوئے
 میدانِ جسم و جاں میں بڑے معرکے ہوئے
 ہم سے کبھی وہ صلح کے قائل نہ تھے ہوئے
 ان بے مکانیوں نے مجھے لامکاں کیا
 پاؤں کہیں زمیں میں نہیں ہیں دھنسے ہوئے
 اس پیرِ تسبیہ پا کا ہمیں نے کیا لحاظ
 ہم اور ورنہ رہنے لگیں یوں پھنسنے ہوئے
 سجدہ گزار ہے تری چوکھٹ پہ چاندنی
 مٹی کے اپنے پاؤں ہیں پتھر بنے ہوئے

۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء

تماشہ ہے رسوائی جاں سے ڈر کر کہاں جاؤ گے
 ہیں شیشے کے سب لے کے ہاتھوں میں کہاں جاؤ گے
 ہے بے چہرگی بے لباسی مقدر کہاں جاؤ گے
 تعاقب میں ہے آنکھ منتظر، بمنظر کہاں جاؤ گے
 انھیں کیا خبر آب و گل سے گزرنے میں کیا لطف ہے
 خیریدوں نے یوں تو کہا تھا کہ بے سر، کہاں جاؤ گے
 کئی آئینے راہ رو کے کھڑے ہیں ذرا سانس لو
 یہی دیکھتا ہے کہ خود سے گزر کر کہاں جاؤ گے
 یہی بے زمینی اگر خیر و البستہ جاں رہے
 اٹھائے ہوئے آسمان اپنے سر پر کہاں جاؤ گے

۱۶ اگست ۱۹۷۷ء

مرا ہم نفس جو گناہوں میں تھا وہی تو مخالف گواہوں میں تھا
 جو تپھر کا بت شاہراہوں میں تھا کبھی دقت کے سربراہوں میں تھا
 تجھے چھوڑ کر بے پناہوں میں تھا یہی نامیں گم کردہ راہوں میں تھا
 کبوتر کو گھیرے ہوئے تھے عقاب کوئی خوش نظر بد لگا ہوں میں تھا
 دعا دے فردزاں لہو کو مرے اندھیرا تری خواہنگاہوں میں تھا
 یقین آگیا یہ زمیں گول ہے جدھر دیکھئے تو نگاہوں میں تھا
 مرے ہاتھ میں وسعتِ آسماں ہر پاؤں دلدل کی بانہوں میں تھا
 وہاں کون تھا خیر اپنے سوا
 جو ہمدرد تھا خیر خواہوں میں تھا

۲ اگست ۱۹۷۸ء

دل دکھ نہ جائے بات کوئی بے سبب نہ پوچھ
 خانہ بدوش لوگوں سے نام و نسب نہ پوچھ
 نانِ جویں کی آس بھی کیا شے ہے اب نہ پوچھ
 پردیسیوں سے مشغلہ روز و شب نہ پوچھ
 بے گھر ہوئے ہیں دیدہ بے خواب کے قتیل
 اب جگنوؤں سے لذتِ رودادِ شب نہ پوچھ
 میرے لہو ترنگ سے ٹھہرا ہے سرخ رو
 کیا کیا نہ رنگ ہیں تیری آنکھوں کے اب نہ پوچھ
 اک شعلہ شراب بھی ہیں آفتاب بھی
 اس زمہریرے میں ترے شاداب اب نہ پوچھ
 تیرے لئے میں آئینہ پاش پاش ہوں
 کیا کیا ہے میرے واسطے اک تیری چھپ نہ پوچھ

ہم خود شناس بھی ہیں زمانہ شناس بھی

اسی مرحلے میں جان سے گزرے ہیں کب نہ پوچھ

کیسی عجیب صورتِ حالات ہو گئی

پتھر اگیا ہے خیر جو شہرِ حلب نہ پوچھ



تعارف ہی تو ناممکن ہے میرا

بدنِ کافر ہے دل مومن ہے میرا

یہ کیسے کوچہٴ سربستہ میں ہوں

پلٹ آنا بھی ناممکن ہے میرا

۳۰ اکتوبر ۱۹۷۸ء

زہر لگتا ہوں تو اوتاروں کے بیچ
 بوند بھرا مرت ہوں بیماروں کے بیچ
 میں کسے ناراض کس کو خوش کروں
 مہم کا پستلا ہوں انگاروں کے بیچ
 راہ سازی تو مری فطرت میں ہے
 قید کیا رہتا میں دیواروں کے بیچ
 میں اُسی سکتے میں لوٹتا بھی ہوں
 آئینہ ہوں آئینہ داروں کے بیچ
 ہم پریشاں، بے زمین کے شکار
 لوگ خوش اپنی ہی دیواروں کے بیچ
 خیر مانا میں کوئی سورج نہیں
 اک کرن ہوں اور اندھیاروں کے بیچ

رہے خیال کہ چھاؤں بہت گھنی نہ رہوں
 بچوں ہوا سے تو محروم روشنی نہ رہوں
 میں اس نواح میں کب تک شنیدنی نہ رہوں
 یہ کس عذاب میں ہوں حرفِ گفتنی نہ رہوں
 میں خاکِ رقیقاً ہوں اتنی آگ کے ساتھ
 کہ سرکشوں میں سراسر فروتنی نہ رہوں
 اگر یہی ہے ہنر تو مجھے نہیں آتا
 کہ اپنی ذات میں باہر کی کنسٹی نہ رہوں
 ہزار خواہشیں ایسی کہاں کہ دم نکلا
 یہ کیا مذاق ہے اتنا بھی کیا غنی نہ رہوں
 یہ واقعہ ہے کہ منظر بدل ہی جاتا ہے
 تو کیا عجب ہے کسی دن میں دیدنی نہ رہوں
 روفِ خیر یہ بے چارے مستقیم خطوط
 مزہ نہ آئے اگر خطِ منحنی نہ رہوں

یکم مئی ۱۹۷۹ء

تشنہ رہیں گے اپنے بگڑنے کے مرحلے
 آئے جو ہیں نگاہ میں پڑنے کے مرحلے
 میرے لئے زمان و مکاں پھیلنے لگے
 طے ہو رہے ہیں تجھ سے بگڑنے کے مرحلے
 یہ چھالا چھالا پاؤں یہ ہاتھوں کی سختیاں
 یاد آئے تسلیوں کے پکڑنے کے مرحلے
 آنکھوں میں ریت بھر گئی، ہمدرد نکھی ہوا
 تادیدنی تھے خیمے اکھڑنے کے مرحلے
 پھر جیسے پتھروں کے حوالے ہوئے ہیں ہم
 تازک تھے آئینے سے بگڑنے کے مرحلے
 خود کو سنبھالنا بھی قیامت ہے ان دنوں
 اب ہم ہیں اور آگ پکڑنے کے مرحلے
 خوش تھے روزِ خیر جو دنیا سے لڑ چکے
 باقی ہیں اپنے آپ سے لڑنے کے مرحلے

۲۷ جولائی ۱۹۷۹ء

میں اب زیریں گزیدہ، فلک نارسیدہ ہوں
 اس پر بھی خشک لب ہوں، نہ میں آبدیدہ ہوں
 بے عیب کس کی ذات ہے، تو بھی کس ہی یہاں
 لے دوست میں فراخ دل و خوش عقیدہ ہوں
 آنسو تمام۔ پیرہنِ تہقہہ میں ہیں
 لیکن کسے بتاؤں کہ دامنِ دریدہ ہوں
 گو میں صدا بھرا ہوں دنیا کے واسطے
 یہ بھی بہت ہے تیرے لئے توشنیدہ ہوں
 کچھ اور بڑھ گیا "مجھے" پڑھنے کا اشتیاق
 میں تو وہی عبارتِ صد خط کشیدہ ہوں
 ہنستا تھا دیکھ کر تری بے چہرہ گی کبھی
 دیکھا جو آئینہ تو لگا کسرِ بربیدہ ہوں
 دنیا سے سراسر اٹھا کے ملونگار و فخر
 ہاں آئینے کے سامنے گردن خمیدہ ہوں

۲۰ دسمبر ۱۹۷۸ء

عقل سے آنکھ تو ملتا ہوں
 دل کے ہاتھوں فریب کھاتا ہوں
 ساری دنیا سراب لگتی ہے
 تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہوں
 توجو بت ہے تو ٹوٹتا ہے تجھے
 میں کہاں ایسے سر جھکاتا ہوں
 ہائے سب کچھ تمھیں تھے میرے لئے
 یاد کرتا ہوں مسکراتا ہوں
 رشتہ تارِ عنکبوت میں ہوں
 توڑتا ہوں تو ٹوٹ جاتا ہوں
 خیر پہچان ہی سنبھال اپنی
 میں اگر صرف خاک اڑاتا ہوں

۱۰ فروری ۱۹۷۳ء

ٹٹے ہے کہ شہر جہاں کی فضا سے بھی جاؤنگا
جینا ہی ہے تو راہِ فنا سے بھی جاؤنگا

یہ سوچ کر تباہ رہا ہوں مہتا راستہ
تم سے چھٹا تو جہدِ بقا سے بھی جاؤنگا
یہ تو زیادتی ہے کہ میں ہی دفا کروں
اس دن کی سوچ جب میں وفا سے بھی جاؤنگا

پانی پہ اک حباب سہی زندگی سہی
لڑتا ہوا غرور ہوا سے بھی جاؤنگا
چہرہ تو آئینہ ہے چھپاتا کہاں پھروں
تیرے لیے جو راہِ ریا سے بھی جاؤنگا
آنکھوں پہ بڑھ گیا ہے بہت متظروں کا بوجھ
اب چپ رہا تو زورِ نوا سے بھی جاؤنگا
سمٹا ہوا ہوں میں کہ اسی میں بھرم بھی ہے
بکھرا تو وحدتِ صبا سے بھی جاؤنگا

۲۲ فروری ۱۹۷۷ء

اس کا شمار آنکھوں کی ٹھنڈک میں رکھیے
وہ پھول ہے تو کیا اُسے پُستک میں رکھیے

یہ میں نہیں ہوں کوٹا پکاسو کی پینٹنگ
دل کے بجائے مجھ کو نہ بیجاک میں رکھیے

اس لذتِ ثبات سے اکتانہ بجائے دل
کچھ کچھ شکست و ریخت بھی مسکائیے

سب اپنے خوب و زشت کا الہم دکھا دیا
وہ سادہ لوح ہے اُسے کیا شک میں رکھیے

یوں تو نہ کیجئے کبھی لکھیے جوجی کا حال
لجھکے لفظ و معنی گنگناک میں رکھیے

اس سے نفسِ نفس کا تعلق ہے آج بھی

اس کو سجا کے درد کی دستک نہ دیجیے

زاویہ نگاہ کی بے حسرتی نہ ہو
 ہر حاشیہ خلوص کی عینک میں رکھیے
 ٹوٹے کبھی تو رشتہ تیر دسیر بھی خیر
 اک دوسرے کو کیا ہدف زک میں رکھیے



کیسے سمجھاؤں کہ بے سائیگی کیا ہوتی ہے
 شکر کیجئے کوئی سایہ جو ابھی ہے سر پر
 زیر سایہ ہمیں دیکھو تو بڑا مت حبسا نو
 ہم نے اک ٹکڑی دھوپ سہی بچے سر پر

۲۲ مارچ ۱۹۸۰ء

پل بھر میں بے سر ہوتے ہیں کیا تم۔ کیا میں
 مٹی کے پیکر ہوتے ہیں کیا تم۔ کیا میں
 گندم سے بچھے تو حوّا لے اُڑتی ہے
 ویسے پیغمبر ہوتے ہیں کیا تم۔ کیا میں
 چہروں پر لکھا ہوتا ہے کچھ دل میں کچھ
 دھوکے تو اکثر ہوتے ہیں کیا تم۔ کیا میں
 بے سایہ ہو کر کب کوئی خوش ہوتا ہے
 مجبوراً بے گھر ہوتے ہیں کیا تم۔ کیا میں
 پایابی تو اک دھوکا ہے سچ پوچھو تو
 دلدل یا ساگر ہوتے ہیں کیا تم۔ کیا میں
 خیر بھلے ہی کہلاؤ تم کب ہوتا ہے
 اندر سے تو شر ہوتے ہیں کیا تم۔ کیا میں

نومبر ۸۰ ۶۱۹

دنیا نہیں بدلی ہے زمانے ہی تو بدلے
 ہم خانہ خرابوں کے ٹھکانے ہی تو بدلے
 ہم جیسے جیالے ہیں تو بے آسے نہ ہونا
 لے بارِ صداقت ترے تلنے ہی تو بدلے
 اک خطِ شکستہ ہیں ہمیں دستِ ہنریں
 اس حال میں الفاظ کے معنے ہی تو بدلے
 پڑتا نہیں موسم کے بدلنے سے کوئی فرق
 کچھ یوں ترے ملنے کے بہانے ہی تو بدلے
 ہر کوہِ صفتِ روئی کی مانند اڑا ہے
 یہ رنگ یہ تیور بھی ہوانے ہی تو بدلے

ہم دشتِ نورِ دوں کو نہیں خیرِ زمیں تنگ

یہ چالِ چلنِ شہرِ وفائے بکا تو بدلے

۶ جون ۱۹۸۰ء

اہل ہوس میں خیر بظاہر بھی ہم ہوئے
 جی کو ملال یوں ہے کہ شاعر بھی ہم ہوئے
 اے دل نہ ہونا چاہئے تھا پھر بھی ہم ہوئے
 رسوا کبھی کبھی تری خاطر بھی ہم ہوئے
 ٹھوکر نہیں لگی ابھی پائے ثبات کو
 کس منزلِ نفی کے مفسر بھی ہم ہوئے
 چلیئے یہی سہی کہ سبھی خیر خواہ تھے
 اپنے حریفِ اول و آخر بھی ہم ہوئے
 ہم بھی تو چشمِ خاک میں بھسے نو خراب
 اور آسمانِ نژاد بالآخر بھی ہم ہوئے
 سب جھوٹ تھا بچاؤ کے رستے ہمارے
 سچ ہے شکار تو متواتر بھی ہم ہوئے

۲۰ جنوری ۱۹۸۱ء

کچھ دوستوں سے نیک گمانی میں کٹ گئی
باقی خلوص دشمن جانی میں کٹ گئی

اب رتھگے ہیں جیسے لہو میں رچے ہوئے
کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی

ٹھٹھتے جو خاک سے تو بہت آسمان تھے
اک عمر یونہی قید مکانی میں کٹ گئی

تم سے چھٹے تو راہ کے سب پر دم کھلے
زنجیر ربطِ خاص روانی میں کٹ گئی

خود کو ہمیں سنبھال نہ پائے رؤفِ نجیر
دیوارِ ضبط ایک ہی پانی میں کٹ گئی

گہماں گزرتا ہے گم کردہ راہ بھی میں ہوں
 کہ اس نواح میں اک بے پناہ بھی میں ہوں
 یہ لوگ کس لئے شاکی ہیں منصفی سے تری
 خلاف اپنے حقیقی گواہ بھی میں ہوں
 یہ ادربات کہ آنکھیں ہیں آسماں کی طرف
 ہلاکِ حرفِ سفید و سیاہ بھی میں ہوں
 لال یہ ہے کہ تو، سو جھٹا نہیں مجھ کو
 کمال یہ ہے کہ تیری نگاہ بھی میں ہوں
 وہی ہوں میں نہ چلا سحرِ سامری جس پر
 عصائےِ معرکہ لا الہ بھی میں ہوں
 تمہیں خبر نہیں شبِ خون مارنے والو
 جو ابرہہ سے لڑی وہ سپاہ بھی میں ہوں
 تمہیں بھی خیر سے دعویٰ ہے بادشاہی کا
 تمہیں خبر ہو کہ اک کج کلاہ بھی میں ہوں

ستمبر ۱۹۸۱ء

نہ میں عرب ہوں نہ دنیا عجم ہے میرے لئے
 میری خموشی ہی گویا بھرم ہے میرے لئے
 نمو کا جوش سلامت، میں بے نشان نہیں
 کمال یہ ہے کہ ہر خاک نم ہے میرے لئے
 کوئی خار ہو یا ثبت ہو ٹوٹ جاتا ہے
 عجیب مرحلہ کیف و کم ہے میرے لئے
 یہی نظر تو کہیں ٹھہرنے نہیں دیتی
 ترے لیے جو خدا ہے، صنم ہے میرے ہے
 نہ اپنی فکر ہی مجھ کو رہی نہ دنیا کی
 ترا خیال بڑا خوش قدم ہے میرے لئے
 اسے قریب سے دیکھوں تو جانے کیا نکلے
 وہ شخص خیر ابھی محترم ہے میرے لئے

تاجکے منزل بمنزل ہم مکافر بھاگتے
 ۸ ستمبر ۱۹۷۸ء
 آنکھ اب ٹہری ہوئی ہے اور مناظر بھاگتے
 لے حریف ہر قدم شہ مات سے بچنے کی سوچ
 اس بساطِ خاک سے کیا ہم سے شاطر بھاگتے
 ہم تو آئے ہیں یہاں مٹنے مٹانے کے لئے
 اس زمین کو بلا سے کس کی خاطر بھاگتے
 بس میں آجانے کا جذبہ بس میں کمر باندھ کر
 خاک و باد و آب و آتش بھی ہیں قاصر بھاگتے
 سر کہیں پاؤں کہیں آنکھیں کہیں چہرہ کہیں
 اس ہوس میں کھو گئی پہچان آخر بھاگتے
 خیر شبِ خوں مار کر چھپ جانے والے ہم نہیں
 معرکہ سر کرنے نکلے ہیں تو کیا بھر بھاگتے
 کھود لیتے ہیں کنواں شہد اب پالیتے ہیں خیر
 اس زمینِ سخت سے کیا ہم سے شاعر بھاگتے

۲۲ ستمبر ۱۹۷۸ء

اے ہوائے شہر لہجے تھے ترے اکھڑے ہوئے
پھول زخمی ہو گئے گلداں کے ٹکڑے ہوئے

ایک بے تسکین بے خوابی کسی ہے جزو بدن
سو گئے تھے جیسے ہم سمٹے ہوئے سکڑے ہوئے

بے دھواں بے گرد بے آواز تھے سب راستے

ہم جہاں پہنچے وہاں خیمے ملے اکھڑے ہوئے

تھا فقیہ شہر تو ثقلِ سماعت کا شکار

سن رہا تھا کون آخر کیوں بیاں دکھڑے ہوئے

کیا بتائیں کس تکلف میں کٹا عہدِ بہار

کب گریباں چاک تھا دامن کے کب ٹکڑے ہوئے

خیر ہم تو دھوپ کے بن بائیں پر بھیجے گئے

کس سفر میں ساتھ اپنے پھول سے مکھڑے ہوئے

۵ اکتوبر ۱۹۷۸ء

لٹنے کا شوق کب تھا جو سچ دھج کے شہر میں
 لوگ آگئے تھے گاؤں سے سببج کے شہر میں
 کیچڑ گلی گلی ہے تو موسم خراب ہے
 نکلا کر دنہ اس طرح سچ دھج کے شہر میں
 انہونی تھی جو ہو کے رہی دکھ ہی تو ہے
 کیا سائرن تھے زہ گئے بج بج کے شہر میں
 بونے خود اپنے سالوں سے خوش ہم سے ہیں خفا
 اندھیر کقدر ہے یہ سورج کے شہر میں
 اس جنگ میں تو دستِ اماں بھی شریک ہے
 اک بے کلی کا راج ہے دھیرج کے شہر میں
 مہنگا پڑے گا میرا لہو سوچ لیجئے
 میں سخت جاں ہوں قتلِ مروج کے شہر میں

پائے ثبات ہوں میں ہر اک پل صراط پر
 دستِ دراز ہوں کلہر کج کے شہر میں
 انصاف کی جو پوچھو تو کھدوں خطا معاف
 احساسِ مجرمانہ ہے ہر جج کے شہر میں
 ہمراہ جبریل و ابابیل بھی نہیں
 بھیجا گیا ہوں اوس کے خزانج کے شہر میں

میں خطِ خیرِ اسود و ابیض کے درمیان
 حرفِ صحیح — لہجہ کج کج کے شہر میں



جب سے دیواروں کے بھی کان ہوا کرتے ہیں
 بات کیا کرتے فقط ہونٹ ہلا کرتے ہیں

تم ہرے وقتوں میں کیسے جاں کی بازی کھیلتے
جاؤ گھر بیٹھو کسی کو نے میں رمی کھیلتے

کیا بھرے اشجار آخر ہر تھو خالی ہو گئے
بس ہوا گزری تھی یونہی ڈالی ڈالی کھیلتے

کیسے کیسے زمین ہیں اس کھیل کے پیچھے یہاں
تم اکیلے کھیلتے ہم سے تو ہم بھی کھیلتے

اے بساطِ شہر تیرے کتنے ہرے پڑ گئے
اب تو اندازہ ہوا ہو گا ہیں ہم بھی کھیلتے

۱۹ اگست ۱۹۸۰ء

رستے میں تو خطرات کی سن گن بھی بہت ہے
 منزل پہ پہنچنے کی ہمیں دھن بھی بہت ہے
 ہر شہر میں تازہ ہے تو بس زخمِ تعصب
 کچھ لذتِ ناخن کا تعاون بھی بہت ہے
 کچھ ہاتھوں سے کچھ ہاتھوں سے کالک نہیں جاتی
 ہر چند کہ بازار میں صابن بھی بہت ہے
 وہ ہاتھ تحفظ کی علامت جسے کہئے
 محسوس یہ ہوتا ہے وہی سن بھی بہت ہے
 اک جسم کے مانند ہیں ہم لوگ کہیں ہوں
 ٹھوکر سے اکھڑتا ہے تو ناخن بھی بہت ہے
 ہم شر کہا کرتے ہیں وجدان کے بل پر
 کچھ لوگوں کو زعمِ فصلاتن بھی بہت ہے